خلاق مضامین نواب مولانا سید مہدی حسین نقوی ماہرؔ اجتہادی

لسان الہند مولانا مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی

نواب مولوی سید مہدی حسین ابن سید علی حسین ابن سید العلماء مولانا سید حسین ابن غفران مآب مولانا سید دلدار علی نصیر آبادی لکھنؤ کے باکمال اور نازک خیال شعراء میں تھے۔ ان کی خاندانی بزرگی ثابت کرنے کو یہی کافی ہے کہ غفران مآب کے پوتے تھے۔ کرۂ اسلام پر جس کا مقدس نام آفتاب کی طرح اپنی روشنی ڈال رہا ہے۔ شیعی دنیا اس بات پر متفق ہے کہ بارہویں صدی میں ہندوستان کی سرزمین پر پہلا شخص ہے جس نے دین کی بنیادوں کو مستحکم کیا۔ لکھنؤ کی ابتدائی حالت لوگوں کی نگاہ میں ہے۔ آصف الدولہ کا دور شراب اور بھنگ کا عروج اور ضروریات دین کی بے خبری جاننے والے جانتے ہیں۔ تاریخی صفحات پر بھی غالباً واقعات درج ہوں۔ میں مرنے والوں کی روحوں کو شرمندہ کرنا نہیں چاہتا۔ خدا ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اس قلعۂ بدعت کے نیست و نابود کرنے کا سہرا غفران مآب کے سر رہا۔ آصف الدولہ کی روح میں الٰہیات کا جلوہ پیدا کرنے والا یہی شخص ہے۔ تحصیل علوم کے بعد جب ایران سے ہندوستان آئے تو آصف الدولہ کے دربار میں پہنچے۔ یہاں کے حالات پر نظر کر کے برابر اپنے مواعظ میں نواہی کی مذمت کی اور اوامر کی طرف توجہ دلائی۔ ان مجالس وعظ میں خود آصف الدولہ بھی شریک ہوتے تھے۔ شاہ مرحوم جہاں سخاوت و عدالت میں یکتائے روزگار ہوئے۔ وہاں اور عقائد میں بھی ایک بزرگ کی بدولت شہرۂ آفاق ہوئے غفرآن مآب نے اپنی سوانح اور خاندانی تاریخ میں خود لکھا ہے۔ جس کا نام ''آئینہ حق نما'' ہے۔

یہ واقعات طول چاہتے ہیں اگر میں اپنی معلومات کے موافق بھی لکھوں تو ایک مستقل تصنیف ہو جائے گی۔ صرف جناب ماہرؔ کے اعزاز خاندانی کے ثابت کرنے کو چند سطریں لکھی گئیں۔ دنیاوی عزتیں جوان کو ملیں وہ اس شرف کے مقابل میں قابل الذکر نہیں۔

سال ولادت اور ابتدائی زمانہ

۱۳۲۵ھ اکسٹھ سال کی عمر میں ماہرؔ کا چراغ زندگی خاموش ہوا۔ اس حساب سے ۱۲۶۴ھ میں ان کی ولادت معلوم ہوتی ہے۔ لکھنؤ مسقط الراس ہے۔ نو مہینے کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اپنے جد امجد سید العلماء کی آغوش تربیت میں پرورش پائی۔ یہی وہ مدرسہ تھا جہاں انھوں نے اخلاقی سبق حاصل کیا۔ مگر زمانہ نے بہت کم موقع دیا۔ ہنوز ۹ رسال کی عمر بھی نہ ہوئی تھی کہ سید العلماء نے سفر آخرت اختیار کیا اور اس کے بعد ماہرؔ اپنے بڑے بھائی سید باقر حسین صاحب کی زیر تربیت رہے۔ اور انھیں سے تعلیم پائی۔ تعلیم کے حالات مجھ کو مفصل معلوم نہیں کہ استعداد علمی کہاں تک تھی اور کتب درسیہ نظامیہ کو کس سے پڑھا لیکن یہ ضرور ہے کہ ان

کے کلام سے باسواد ہونے کا اندازہ ملتا ہے۔

تاہل

گیارہ سال کی عمر میں سید محمد تقی صاحب (ممتاز العلماء فرقۂ شیعہ کے جید مجتہد) کی کوشش سے تاج محل مرحومہ (زوجۂ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ) کی چھوٹی لڑکی سے منسوب ہوئے۔ تاج محل کی صاحبزادی سے عقد جناب ماہرؔ کی زندگی کا ایک نمایاں واقعہ ہے۔ جس سے دنیوی اعزاز اور لباس فاخرہ ان کے زیب بدن ہوا۔ تفصیلی حالات کا قلم انداز کر کے مجمل حالات حوالۂ قلم ہیں۔

جناب ماہرؔ نے اس نسبت کے زمانہ میں تاج محل کے ساتھ کربلا کا سفر کیا۔ ان کے ساتھ ان منجھلے بھائی سید جعفر حسین صاحب بھی تھے۔ یہ غدر کے بعد کا واقعہ ہے۔ عرصۂ دراز تک سرزمین کربلا پر قیام پذیر رہے۔ اسی زمانہ میں سید جعفر حسین صاحب کی شادی تاج محل کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی۔ ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کے نو مہینے بعد سید جعفر حسین کا انتقال ہوگیا۔ (اس واقعہ کو ناظرین ملحوظ رکھیں) گردش فلکی دیکھو کہ حضرت ماہرؔ کی زوجہ نے بھی تھوڑے زمانے کے بعد رحلت کی اور ان کی دنیاوی امیدوں کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔ ان دو سانحوں کے بعد یہ ایسے برداشتہ خاطر اور تنگ دل ہوئے کہ تاج محل سے لکھنؤ جانے کی درخواست کی اور بہت اصرار کیا مگر انھوں نے کسی طرح اجازت نہ دی۔ درحقیقت ان کی شان بھی یہی تھی کہ ایسی حالت میں ان کو اجازت نہ دیتیں چنانچہ ان کے اصرار اور مزید التفات سے یہ وہیں رہے۔ آخر میں نواب تاج محل صاحبہ نے اپنی دختر بیوہ (زوجۂ سید جعفر حسین) کا عقد ان کے ساتھ کر دیا۔ تھوڑے ہی زمانہ کے بعد انھوں نے زوجہ کو ساتھ لے کر مکہ معظّمہ کا سفر کیا۔ اور واپسی کے وقت پہلے خود بیمار ہوئے اور جب نجف پہنچے تو ان کی زوجہ کا حمل ساقط ہوا۔ اسی صدمہ میں انھوں نے انتقال کیا۔ کل آٹھ مہینے دونوں کا ساتھ رہا چھ ماہ کے بعد جب ماہرؔ نے دوسرا عقد کیا اور لکھنؤ واپس آئے۔ نواب تاج محل کو کسی قدر اس واقعہ سے رنج پہنچا۔ مگر ان کے مصالح اس وقت اسی کے مقتضی تھے۔ لکھنؤ پہنچنے کے ایک سال بعد ان کے چچا مولوی کلب حسین صاحب (یہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے تاج محل سے عقل کر لیا تھا اور انھیں کے ساتھ کربلا میں رہتے تھے) نے انتقال کیا۔ جناب ماہر اس زمانہ میں نہایت عسرت سے رہتے تھے۔ صرف تیس روپیہ ماہوار بطور پنشن ان کو ملتے تھے اسی مقدار میں اپنی بسر کرتے تھے۔

مولوی کلب حسین کے انتقال کو ابھی چار برس نہ گذرے تھے کہ نواب تاج محل نے دنیا کو خیر باد کہا۔ خاندانی مجموعہ کا شیرازہ ابتر ہوگیا۔ ماہرؔ کو یہ خبر بذریعہ تار معلوم ہوئی۔ اسی وقت معہ اہل وعیال روانہ کربلا ہوئے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے اپنے حقوق حاصل کرنا چاہے مگر بڑی بڑی زحمتیں اٹھائیں جیسی جیسی کوششیں کیں ان کو جاننے والے جانتے ہیں۔ نواب تاج محل کے مرتے ہی ان کی جائداد منقولہ وغیر منقولہ پر نواب اقبال الدولہ کا چوکی پہرا ہوگیا۔ جواہرات بیش بہا کے صندوقچے غائب کر دیئے گئے۔ جو کچھ باقی رہ گیا اس پر تعلیقہ ہوگیا۔ مکانات ومحل سرا پر زبردست پہرا زیادہ

اس خیال سے تھا کہ سید مہدی حسین نہ آسکیں مگر انھوں نے بھی باوجود بے سروسامانی کے ایسی بلیغ کوششیں کیں کہ ان مکانات ومحل سراوغیرہ پر اپنا پورا قبضہ کرلیا۔ اب نواب عباس علی خاں عرف چھٹن صاحب (تاج محل کے بھائی) سے مقدمہ بازی شروع ہوئی۔ وہ ان کی بھتیجی (دختر سید جعفر حسین) کو ناجائز اور محروم الارث اولاد ثابت کرنا چاہتے تھے۔ مگر ان کی یہ سطحی کارروائیاں نہ چلیں اور ماہرؔ نے وراثت حقیقی ثابت کی اٹھارہ سال تک لندن، قسطنطنیہ بمبئی، کلکتہ، لکھنؤ میں مقدمہ لڑتے رہے۔ نتیجہ میں کامیاب ہوئے اور فیصلہ انھیں کے موافق ہوا۔ دوران مقدمہ میں ایک مقدار کثیر کے قرض دار ہوگئے تھے۔ مالی معاملات کی نزاعیں دنیا میں ایک دوسرے فریق کو جانی دشمن بنادیتی ہیں۔ ماہرؔ مرحوم کو ایک مرتبہ زہر بھی دیا گیا اور کئی بار گولیاں ماری گئیں۔ مگر

''دشمن اگر قوی است نگہباں قوی تر ست''

نواب میر اصغر حسین فاخرؔ کی شادی

دنیا کی یہ پرانی رفتار ہے کہ مال وزر کی طرف اہل دنیا کا میلان فطری ہوتا ہے۔ چنانچہ نواب تاج محل مرحومہ کی نواسی (دختر سید جعفر حسین) سے بہت بہت لوگوں کی خواہش تھی کہ شادی ہوجائے مگر ماہرؔ نے اس خیال سے کہ وہ لڑکی اب ان کے خاندانی سلسلہ میں داخل ہے مناسب سمجھا کہ اس کا عقد غفران مآبؒ کی اولاد سے ہونا چاہئے۔ اس خیال سے فوراً بذریعہ تار اپنے بھتیجے سید اصغر حسین کو لکھنؤ سے بلوا کر اس لڑکی کا عقد ان کے ساتھ کردیا۔ اس معاملۂ خاص میں بھی ان کے خلاف بہت کچھ کوششیں کی گئیں مگر کارگر نہ ہوئیں۔ یہ صاحبزادی جن سے جناب فاخرؔ کا عقد ہوا ان کی حقیقی چچازاد بہن ہیں۔

مقدمۂ خاص محل

آخر زمانہ میں نواب ننھے مرزا سے خاص محل کا مقدمہ مول لیا اور دس بارہ برس تک لڑتے رہے یہاں تک کہ لندن سے انھیں کے موافق فیصلہ ہوا اور پانچ لاکھ سینتیس ہزار کی ڈگری ہوئی۔ مگر روپیہ ابھی ملا نہیں۔ ان کے خصوصیات میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کے دل ودماغ کو مقدمات سے بہت زیادہ دلچسپی تھی اور قانونی باریکیوں پر ان کی نظر ویسی ہی حاوی تھی جیسے بیرسٹر اور وکلاء کی۔

شاعری

باوجود ان جھگڑوں کے شاعری نہ چھوٹی۔ دیکھو فطری شاعر کی یہی علامت ہے کہ اس کا دماغ کیسی ہی حالت میں ہو مگر اپنے ذوق سے فارغ نہ ہو۔ حضرت ماہرؔ تلمیذ مظفر علی خاں صاحب اسیرؔ کے شاگردان خاص میں ایک ممتاز شاگرد تھے۔ اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے ان کا دماغ خاص اسی کام کے لئے وضع ہوا تھا۔ جن لوگوں نے ان کے مرثیے یا اور کلام دیکھا ہے وہ میری تائید کریں گے۔

ماہرؔ کو لکھنؤ کے ٹکسال میں کاملان فن نے کامل العیار تسلیم کرلیا ہے۔ اساتذہ فن نے اپنی اپنی جگہ ان کو خلاق المضامین مان لیا ہے۔ ان کے دماغ میں جب کسی مضمون کی شاخ پیدا ہوتی تھی تو اس شاخ سے ہزاروں کوپلیں اور ہر کوپل سے سیکڑوں پھول نکلتے چلے آتے تھے۔ بیلوں کی طرح ان کے خیالات بلندی کی طرف مائل ہوتے جاتے

تھے۔ سلسلہ کا ختم ہونا دشوار ہو جاتا تھا۔ آخر وہ اُکتا کر اسے چھوڑ دیتے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو ایک مضمون کو مدتوں نظم کرتے چلے جاتے اور ہمیشہ نئے پہلو سے۔ جس طرح زبان کے سوتوں سے پانی ابلتا ہے یا پہاڑ سے آبشار کی روانی اسی طرح ان کے دماغ سے پے در پے مضامین پیدا ہوتے چلے جاتے تھے۔ میدان شاعری کے بڑے بڑے شہسواروں کے ساتھ ہم قدم رہتے تھے۔

فن شعر میں ان کی یادگار نواب میر اصغر حسین فاخرؔ تھے۔ سوا ان کے ماہرؔ نے کسی کے کلام پر اصلاح نہیں دی اور نہ وہ اسے اچھا مانتے تھے۔ ایک مرثیہ کے چند بند[۱] ان کے اس خیال پر شاہد ہیں

شاگردوں کی کثرت سے خودی ہوگئی برباد
حد سے جو بڑھی حرص تو یہ بھی نہ رہا یاد
آخر کو نہ اپنے ہی سخن کی رہی بنیاد
شاگرد وہ کم کرتے تھے جو لوگ تھے استاد
صد شکر کہ میں خانۂ برباد نہیں ہوں
استاد وہی ہیں تو میں استاد نہیں ہوں

[۱] بہ خیال طوالت صرف ایک بند نقل کیا گیا ہے۔ مسعود

مجالس عزا کا شوق

مرحوم کی یہ صفت اور حسن عقیدت قابل ذکر ہے۔ مجلسوں سے ان کو ایک خاص انہاک تھا۔ عشرۂ محرم میں جیسی مجلسیں حضرت ماہرؔ کے یہاں ہوتی تھیں بہت کم اس قدر اہتمام اور خوش سلیقگی سے کسی رئیس کے یہاں ہوتی ہیں۔ وہ اہل مجلس کی خاص طور سے خدمت کرتے تھے۔ ہر کہ ومہ سے ان کے اخلاق بہت وسیع رہتے تھے۔ ذاکر جب منبر پر جاتا تھا تو بوجہ ثقل سماعت منبر کے قریب جا کر بیٹھتے تھے اور بہت زیادہ روتے تھے مجلس ختم ہونے کے بعد میں نے خود دیکھا ہے کہ رونے والے کے آنسو اپنے رومال میں پونچھتے تھے اور خود زار زار روتے جاتے تھے۔

اخلاق

مولوی مہدی حسین ماہرؔ تاج محل کے داماد تھے اور ان کے ممتاز اہل دول میں ان کا شمار تھا مگر نشۂ دولت نے ان کو کبھی بے خود نہیں کیا۔ ان کے اخلاق کا رہین منت ناچیز عزیزؔ بھی ہے۔ ہر شخص سے نہایت خلوص اور انکسار سے ملتے تھے باطن بھی ان کا ظاہر کی طرح صاف تھا، کبھی کبھی اپنے مرثیے سنانے کے لئے ایک مخصوص صحبت کیا کرتے تھے جس میں اس ناچیز کو بھی یاد کرتے رہے۔

آخری زمانہ

آخر عمر میں ثقل سماعت اور ضعف بصارت بہت ہو گیا تھا۔ دیکھنے سننے سے معذور تھے سال میں چند مجلسیں کرتے تھے جس میں اپنے نئے مرثیے اپنے بڑے صاحبزادے سید نظیر حسین صاحب سے پڑھواتے تھے۔ میں نے ان مجلسوں میں اکثر دیکھا کہ نظیر حسین صاحب اگر مرثیہ پڑھتے پڑھتے کبھی رُکے یا کبھی کسی مصرع کے پڑھنے میں یا ادا کرنے میں سقم ہوا تو ماہرؔ مرحوم اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور خود پڑھنے لگتے تھے۔ اس وقت ان کا جوش وخروش اور ان کا زور وشور دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ سننے والوں پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی تھی کیونکہ دیکھنے سے معذور تھے، مرثیے کو آنکھ سے لگا کے بہت دقت کے ساتھ کچھ حرف دکھائی دیتے تھے۔ تعریف کرنے والوں کی آواز سن نہیں سکتے تھے مگر

اشاروں پر سلام کرتے جاتے تھے یا جب کوئی متنبہ کرتا تھا کہ فلاں شخص بہت تعریف کر رہا ہے تو اس کو خاص طور سے سلام کرتے اور شکریہ بجالاتے تھے۔ ہائے ان آنکھوں نے جو کچھ سماں دیکھا تھا وہ سب خواب پریشاں ثابت ہوا۔ ماہرؔ کہاں اور ان کی معجز بیانی کہاں۔ ۱۶ / ماہ ربیع الثانی ۱۳۲۵ھ میں اس دنیا کو خیر باد کہا۔ یہاں مرحوم کا ایک شعر یاد آ گیا ؎

ہم اپنی راہ آئے تھے جاتے ہیں اپنی راہ
دنیا رہے زمین رہے آسماں رہے

اپنے جد امجد غفران مآب کے امام باڑہ صدر کے حجرے میں دفن کئے گئے۔ مرحوم کی مجلس چہلم میں ہیچمد اں نے ایک مرثیہ عرض کیا تھا جو ہدیۂ ناظرین ہے۔[۱]

[۱] اس مرثیہ میں مسدس کے چودہ بند ہیں اور فارسی میں ہیں۔ آخری بند میں مادۂ تاریخ وفات ہے جو پیش ناظرین ہے۔ شروع کے تیرہ بند بہ خیال طوالت نقل نہیں کئے گئے۔ مسعود

برکنار بحرجوں بردند نعش آں جناب
از لطافتہائے طبعش آب شددر اضطراب
زاں سپس آن ذرۂ مہر آشنائے بو تراب
زیر خاک آسودہ در گورابۂ غفران مآبؒ
سال فوتش را بحسن تعمیہ دادم نشاں
داخل خلد بریں شد ماہرؔ معجز بیاں
۸۹۶ + ۴۲۹ = ۱۳۲۵ھ

اولاد

زوجۂ اولیٰ سے نواب سید نظیر حسین صاحب، نواب مولوی سید عابد حسین صاحب زوجۂ سید محمد اصطفیٰ صاحب خورشیدؔ [۲] لکھنوی، زوجۂ ثانی سے زوجۂ جناب چھنگا صاحب حسینؔ۔

[۲] یہ بزرگ لکھنؤ کے مشاہیر شعراء میں تھے اور مسلم الثبوت استاد تھے۔ آئندہ ان کے حالات لکھوں گا۔ عزیز

مرثیہ گوئی

مولوی مہدی حسین ماہرؔ صاحب نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ مرثیہ گوئی میں صرف کیا۔ ان کے مراثی کا حصہ بہ نسبت غزلیات بہت زیادہ ہے۔ جس مرثیہ کو دیکھئے مضامین کا ایک دریا اُمڈا چلا آتا ہے۔ کہیں پر طبیعت نہیں رکتی۔ یہاں چند بند مختلف مرثیوں کے لکھے جاتے ہیں۔

مناظر

مرثیہ میں جہاں اور موضوعات ہیں وہاں ایک قدرتی مناظر کی مصوری بھی ہے جو اس کا قوی عنصر ہے اور قریب قریب سب کے مراثی میں ہے۔ اردو میں اس کی ابتداء جس طرح چاہئے تھی میر انیسؔ نے کی اور انھیں پر ختم ہوئی۔ مغربی شاعری کے پسند کرنے والے اسی سے انیسؔ کی شاعری کا کلمہ پڑھتے ہیں جو قدرت انھوں نے حاصل کی تھی وہ اردو میں پہلی مثال تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے قلم نے فوٹو گرافی کا کام دیا۔ اس وقت ان سے بحث نہیں ان کی شاعری کو مجھ سے بدرجہا بہتر معاصرین دکھا چکے ہیں۔ چونکہ مرثیہ کے ذکر میں میر انیسؔ کا نام آ جانا فطرت میں داخل ہو گیا ہے اس لئے یہ چند سطریں قلم سے از خود نکل گئیں۔ ماہرؔ مرحوم کے مرثیوں میں بھی یہ جز ایک مہتم بالشان جز ہے۔ جہاں تک میں نے خیال کیا ان کو اس انداز سخن کی مصوری پر بہت اچھی دست گاہ تھی۔ بڑے زوردار مصرع نکالتے تھے اور اچھی تصویریں کھینچتے تھے۔ یہاں پر مختلف مناظر کے چند بند لکھتا ہوں:

حضرت قاسم کے حال کا مرثیہ ہے اور شادی کے

حالات نظم کئے ہیں

یہ ذکر تھا کہ جہاں میں دم سحر آیا
برات لے کے ستاروں کی خود قمر آیا
اَخیر رات میں معشوق سیمبر آیا
سحر کے ہوتے ہی دولہا دلھن کے گھر آیا
چلی نسیم کہ دل میں کٹاریاں اتریں
ستارے چرخ سے ٹوٹے سواریاں اتریں

نظر فلک پہ سحر کے جب انتظام آئے
شفق کا باغ کھِلا وقتِ دورِ جام آئے
زبان بلبلِ شیدا پہ گل کے نام آئے
نسیم آنے لگی وصل کے پیام آئے
نہ بلبلوں کو فقط لطف وصل ملتے تھے
پھرے جو دِن تو شجر کے بھی پھول کھلتے تھے

عروس صبح جو سلمائے بے حجاب ہوئی
شفق کے دور میں مست شراب ناب ہوئی
گلوں کے رخ پہ ہر اک پنکھڑی نقاب ہوئی
حیا یہ شرم سے سمٹی کہ آفتاب ہوئی
اداؤ ناز کے وقت آئے گھاتیں ہونے لگیں
ڈھکی ڈھکی گل و بلبل میں باتیں ہونے لگیں

صبح اور بہار

جب دکھائی سحر غم کی ضیا تاروں نے
پائی تخفیف سی کچھ درد میں بیماروں نے
کروٹیں فرش پہ لیں صبح کے بیداروں نے
آنکھیں کھلوا دیں ہر اک طیر کی چہکاروں نے
جان اس نیند پہ کس کس کو نہ دیتے دیکھا
کروٹیں سبزۂ صحرا کو بھی لیتے دیکھا

وہ فلک حسن کا دریا وہ کواکب کا عبور
صبح کا نور وہ کم کم وہ دھند ھلکاتا دور
جب یہ تھا وقت یہ عالم یہ تجلی یہ نور
گردنیں پَر میں چھپائے ہوئے بیٹھے تھے طیور
جب نسیم آتی تھی سر سوئے فلک اٹھتے تھے
کوئی کوپل بھی جو ہلتی تھی چہک اٹھتے تھے

رخصت شب کے وہ آثار سحر کا وہ ظہور
چھاؤں تاروں کی کہیں اور کہیں چھٹکا ہوا نور
وہ لہکتے ہوئے سبزے پہ ہواؤں کا مرور
کج کیے گردنیں تکتے تھے سوئے چرخ طیور
تھا یہ مطلب کہ یوں ہی سیر پُرافسوں دیکھیں
دشت اس آنکھ سے اس آنکھ سے گردوں دیکھیں

سبزۂ دشت سے وہ طائروں کے غول اٹھنا
وہ سر شاخ کسی طیر کا پَر تول اٹھنا
زمزموں کے لئے منقار کہیں کھول اٹھنا
ایک کا ایک کی آواز پہ وہ بول اٹھنا
یہ بھی ہوتا تھا کبھی نیند جو لے اُٹھتے تھے
اپنے نالوں کا جواب آپ ہی دے اٹھتے تھے

پہلوئے گُل میں وہ بلبل کا ترانہ ہر بار
باتوں باتوں میں وہ پھولوں کا ہنسانا ہر بار
وہ نشانوں کا سحر کے نظر آنا ہر بار
ٹوٹے تاروں کا وہ نزدیک سے جانا ہر بار

حسن تھا صبح میں بھی دلبر مہرو کی طرح
تارے ہاتھوں سے نکل جاتے تھے جگنو کی طرح

لہر سبزے کی وہ کوسوں وہ سحر نوارنی
فرش تھے مخمل ابریشمی وکاشانی
آب فوارہ نہ گرتا تھا دم طغیانی
تن کے خود دیکھتا تھا حسن کو اپنے پانی
آب نے کیسی دکھائی تھی روانی آخر
پھر گیا حسن پہ فواروں کے پانی آخر

سرخ وہ رنگ شفق وہ فلک ز نگاری
طائروں کی وہ صدا نخل پہ باری باری
وہ ہر اک پھول پہ گلکاری وینا کاری
دیکھتا تھا جنھیں تھم تھم کے خود آب جاری
کس کی اب عقل میں ہر گل کا قرینہ آئے
پائے فوارہ پہ جب سر کا پسینہ آئے

در شبنم کی وہ پیشانیٔ گل پر چھپکے
آنکھ نرگس کی بھلا دید میں کیوں کر جھپکے
ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوا اور وہ بو کے بھبکے
اوس وہ کھائی تو کچھ اور بھی پودے پھپکے
صبح ہوتے ہی بنی عرش کے پائے کی طرح
کیا زمیں تھی کہ شجر بڑھتے تھے سائے کی طرح

صبح

سحر کے حسن پہ جب طرہ آفتاب ہوا [۱]
لگا کے ڈانڈیہ کہتے تھے پانی پر ملاح

تجھی سے نور مسا ہے تجھی سے نور صباح
ترے ہی پاس ہے ہر باب بستہ کی مفتاح
تو ہی نے کشتیوں کو بحر میں کیا سیاح
پہنچ ہی جائے گا منزل پہ بار اپنا بھی
کرم ترا ہے تو بیڑا ہے پار اپنا بھی

[۱] امام حسنؑ کے حال کا مرثیہ ہے اس میں پانچ سو بند ہیں

وہ وقت صبح وہ دریا وہ کشتیوں کا تھاؤ
وہ ناخدا کا یہ کہنا یہی رہے برتاؤ
ولی ولی کا وہ غل وہ خلاصیوں کا جماؤ
علی علی وہی پھر ہاں نکل چلی ہے ناؤ
عیاں ہے سب پہ یہ جو حیدر میں زور باری ہے
وہ در تھا کون سا جس پر سے فوج اتاری ہے

فوارہ

دلوں کو سیر سے فواروں کے نہ کیوں ہو سرور
انھیں سے الجھے نظر آتے تھے خطوطِ نور
بہارِ باغ میں اُڑ اُڑ کے جاتے تھے تا دور
نہال جان کے جب ان پہ بیٹھتے تھے طیور
مزہ تو یہ ہے کہ ہرموئے دل پہ درہ تھی
جو سیر آب میں تھی اس پہ بھی یہ طرہ تھی

میں کہہ چکا ہوں کہ مضمون آفرینی کے وقت ان کا سلسلۂ خیال لامتناہی ہوجاتا ہے۔ بہت سے بند فوارے کے متعلق مختلف مرثیوں میں ہیں جن کے بعض مصرع یہاں لکھتا ہوں:

زمیں کو دھوتی تھی شبنم فلک کو فوارے[۱]
یہ جس کی فکر تھی اس کا دماغ کیسا تھا

نہال آب تھی جس میں وہ باغ کیسا تھا [۲]
ازل سے عقد زباں وسخن ہے عالم میں

[۱] امام حسنؑ کے حال کا مرثیہ ہے۔اس میں ۵۰۰ بند ہیں
[۲] حضرت قاسم کے حال کا مرثی ہے۔۵۰۰ بند ہیں

تعریف آب

صفا سے ماہیوں کا موئے پر بھی آئے نظر
یہ کیا کہ جنبش قلب وجگر بھی آئے نظر
جگر یہ کیا ہے نفس کا اثر بھی آئے نظر
اثر یہ کیا ہے خود اپنی نظر بھی آئے نظر
کچھ اس طریق سے آنکھوں کو راہ ملتی تھی
جو شے تھی تہ پہ وہ نظروں کے ساتھ ہلتی تھی

لطیف وہ کہ جو ہمراہ آب و تاب بڑھے
بڑھے نگاہ تو موجوں کا پیچ وتاب بڑھے
ملے اگر پر ماہی تو اضطراب بڑھے
چھلک پڑے جو ذرا موتیوں کی آب بڑھے
کمی کی شکل تھی وہ جس سے ہٹ گیا پانی
جب آئی آنکھوں میں خنکی تو گھٹ گیا پانی

گرمی

یہ حال جب ہو تپش کا تو اس کا کیا ہو حساب
گھرا تھا آب میں خود آفتاب عالم تاب
بنی تھی سوختہ ریشم ہر ایک موجِ آب
وہ دغ کے رہ گئی ماہی جو آئی زیر حباب
ثبوت کیوں نہ ہو دعویٰ کا اس گواہی پر
وہی ہیں داغ جو اب تک ہیں پشت ماہی پر

تپش سے غیر تھی حالت ہر اک حباب کی بھی
یہاں تلک کہ بھنور کی بھی موج آب کی بھی
شعاع مہر کی بھی نورِ ماہتاب کی بھی
زبان پیاس سے نکلی تھی آفتاب کی بھی
ہر ایک نہر سے تھا فرق شان نہر میں بھی
پڑے تھے پیاس سے کانٹے زبان نہر میں تھی

سیاہ جل کے جو رنگت تھی ہر سحاب کی بھی
رکی تھی سانس ہوا کی بھی ہر حباب کی بھی
زبان پیاس سے اینٹھی تھی موج آب کی بھی
لگی تھی جان تری سے خود آفتاب کی بھی
مزاج خار تو کچھ اور بھی عذاب میں تھے
فلک پہ مہر تھا پائے شعاع آب میں تھے

وہ دشت اور وہ گردوں کی آتش افشانی
فرات تھی کہ زمیں کے عرق کی طغیانی
ہرے تھے نخل نہ سبزے کا رنگ تھا دھانی
جبھی کی دھوپ سے تیغوں کا خشک ہے پانی
ثمر جو نخل میں ہے وہ گل فسردہ ہے
جبھی سے ماہیٔ جوہر ہر ایک مردہ ہے

تپش وہ آئی جو تھی امتحان تیغ میں بھی
لگی تھی جوہروں سے آگ جانِ تیغ میں بھی
نہ جوہروں سے ہو کیوں فرق شان تیغ میں بھی
پڑے تھے پیاس سے کانٹے زبان تیغ میں بھی
ملا بھی آب تو وہ جس سے دل ٹھہر نہ سکا
جو حلقِ خشک میں قبضوں کے بھی اُتر نہ سکا